Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:11 (1969) © rasailojaraid.com

تحریکِ ولی اللہی میں عقلیت[1] کا عنصر

محمد سرور

ایک عظیم صاحبِ دعوت مفکر کی حیثیت سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کے بہت سے پہلو تھے۔ اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد کی اس جامعیت کو ایک حد تک اپنی ذات میں قائم رکھا، چنانچہ اُن سے ہر مکتبِ خیال کے طالبانِ علم استفادہ فرماتے رہے، اور اس طرح برصغیر پاک و ہند کے ہر حصے میں اُن کے شاگرد اور مسترشدین پھیل گئے۔[2]

شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک معاصر مولوی عبدالقادر رام پوری جو شاہ صاحب کی مجلسِ وعظ میں شریک بھی ہوتے رہے، اور خود بھی مختلف علوم پر عبور رکھنے والے عالم تھے، اپنی کتاب "وقائع عبدالقادر خانی" میں لکھتے ہیں:-

"اب اس شہر کے وہ اہلِ کمال گنتا ہوں، جو بندہ کے زمانے میں موجود ہیں۔ مولانا شاہ عبدالعزیز خلیفہ حقیقی و پسر جناب شاہ ولی اللہ محدثؒ ہیں۔ ہر زبان، اردو، فارسی، ایرانی، تورانی، دہلی کی مختصر زبانی اور عربی میں ایسا خوش بیان میں نے بہت کم دیکھا ہے ..... مولانا شاہ عبدالعزیز علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرۂ آفاق تھے۔ اور ہیئت، ہندسہ، مجسطی،

۱؎ عقلیت سے یہاں مراد RATIONALISM ہے۔

۲؎ شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانے میں ایک عالم بیرون ملک سے ہندوستان آئے، اور اُنہوں نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں پورے ہندوستان میں علم حدیث کا کوئی ایسا اُستاد نہ ملا، جو شاہ عبدالعزیزؒ کا شاگرد نہ ہو۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک از مولانا عبیداللہ سندھی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مناظر، اصطرلاب، جرِ ثقیل، طبیعیات، الٰہیات، منطق، مناظرہ، اتفاق، اختلاف، ملل و نحل، قیافہ، تاویل، تطبیقِ مختلف اور تفریقِ مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے۔ فنِ ادب اور ہر قسم کے اشعار سمجھنے میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ منقول میں کلام اللہ اور حدیث سے دلیل پیش کرتے تھے۔ اور معقول میں جو ثبوت مناسب سمجھتے۔ خواہ مخواہ یونانیوں میں سے افلاطون، ارسطو، اور متکلمین سے فخر رازی وغیرہ کے اقوال کی تائید میں مبتلا نہیں ہوتے تھے[۱]۔۔۔۔۔۔۔"

اب شاہ عبدالعزیز کی جامعیت میں اگر کوئی کمی رہ جاتی تھی، تو وہ ان کے بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کی بدولت پوری ہو جاتی تھی۔ مولوی عبدالقادر رام پوری ان دونوں بزرگوں کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "مولوی رفیع الدین جامع الکمالات تھے، لیکن فنون ریاضیہ کی تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ ان کا حافظہ ان کے ذہن تاباں سے بڑھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ مولوی عبدالقادر۔ تینوں بھائیوں میں کمال رکھتے تھے۔ تمام فنون سے واقف، لیکن تفسیر اور حدیث کی خدمت ان کا معمول تھا۔ اکبر آبادی بیگم کی مسجد میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے[۲]۔۔۔۔۔۔۔"

سر سید احمد خاں شاہ رفیع الدین کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔ "دیارِ ہندوستان کے جمیع فضلائے نامی انہیں حضرت رفیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں۔ ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متبائینہ اور علوم مختلف کا درس فرماتے تھے۔۔۔۔۔۔ باوجود ان کمالات کے اضافہ فیضِ باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی اور حسن بصری اگر ان کے وقت میں ہوتے، تو بے شک و ریب اس میں اپنے تئیں کمترین مستفیدان تصور کرتے۔" [۳]

غرض شاہ عبدالعزیز اور ان کے ان دو نامور بھائیوں کی بدولت جہاں ایک طرف شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی

---

[۱] اردو ترجمہ "وقائع عبدالقادر خانی" جلد اوّل صفحہ ۲۴۶۔ اُردو کے مشہور شاعر مومن نے شاہ عبدالعزیز کا جو مرثیہ لکھا ہے، اس کا ایک شعر ہے ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

[۲] اردو ترجمہ "وقائع عبدالقادر خانی"۔ [۳] اردو ترجمہ "وقائع عبدالقادر خانی" حاشیہ از محمد ایوب قادری۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فکری و علمی جامعیت کا سلسلہ برقرار رہا، وہاں دوسری طرف خواص سے آگے عوام بھی دعوتِ ولی اللٰہی سے متعارف ہوتے گئے۔ اس ضمن میں مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں :۔" امام عبدالعزیزؒ نے یہ کیا کہ ان کے زمانے میں عام علماء جن علوم سے زیادہ مانوس تھے، موصوف نے خود بھی ان علوم میں خاص دلچسپی لی۔ آپ مروجہ درسی کتابوں میں جو اقوال شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے خلاف پاتے، ان پر بڑی لطافت سے بتدریج جرح کرتے جاتے اور آخر میں بہت ہلکے الفاظ میں شاہ ولی اللہ کا قول نقل کر دیتے۔ اس طرح ولی اللٰہی فکر آسانی سے دماغ میں جذب ہو جاتا .... شاہ عبدالعزیزؒ کے ساتھ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر بہترین معاون ثابت ہوئے۔ عقلی مسائل کے لئے جس قدر تحقیق کی ضرورت ہوتی، اس کو شاہ رفیع الدین پورا کرتے رہے۔ کشفی مسائل میں خصوصیت کے ساتھ شاہ عبدالقادر ممتاز تھے۔ نقلی علوم کی تعلیم شاہ عبدالعزیزؒ کے ذمے تھی۔ اس طرح علم کے تینوں ذرائع یعنی عقل، نقل اور کشف کی مدد سے ایک جامع سوسائٹی پیدا کرنے کی کوشش جاری رہی ...."[1]

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا دائرہ ارشاد و تدریس صرف خواص تک محدود تھا، لیکن شاہ عبدالعزیزؒ کے مخاطب اور سامع خواص کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے کے لوگ بھی تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں :۔" خواص کی ان جماعتوں کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ امام عبدالعزیزؒ نے عوام مسلمانوں کو اپنے مقاصد سے آشنا کرنے کے لئے ہفتے میں دو بار وعظ کہنا شروع کیا۔ اور اس پر آخر عمر تک عمل پیرا رہے۔ ہفتہ میں دو بار منگل اور جمعہ کو دہلی کوچہ چیلاں کے پرانے مدرسہ میں مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی، جس میں خواص و عوام مور و ملخ کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ طرز بیان ایسا دلکش تھا کہ ہر مذہب کا آدمی مجلس وعظ سے خوش ہو کر اٹھتا تھا۔ آپ کی کوئی بات کسی کو گراں نہ گزرتی تھی .... امام عبدالعزیزؒ کے ان وعظوں سے عوام میں مستقل بیداری پیدا ہوتی۔ اور خواص ان سے یہ سیکھتے کہ وعظ کے ذریعہ عوام کی کس طرح تربیتِ فکری کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ تربیت یافتہ خواص آپ کی تحریک کے داعی بن کر ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیل گئے ......" شاہ عبدالعزیزؒ کا ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں انتقال ہوا۔ ان سے پہلے ہی ان کے دونوں بھائی رحلت فرما چکے تھے۔"

---

[1] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی دعوت کے بہت سے پہلو تھے، جن میں سے ہر ایک پہلو خود اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائیوں کے دور تک تو ان تمام پہلوؤں میں ایک طرح کی جامعیت اور ہم آہنگی رہی، اور تحریک ولی اللہی کا فکری مرکز بھی کم و بیش ایک ہی رہا، لیکن اس کے بعد یہ پہلو مرورِ زمانہ سے مختلف مکاتبِ خیال و عمل میں بدل گئے۔ اور ان کی الگ الگ راہیں بن گئیں جن میں افسوس ہے بعض دفعہ آپس میں اختلاف بھی پیدا ہو گئے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے والد شاہ عبدالرحیم کا اپنا ایک مدرسہ تھا، جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے والد کی وفات کے بعد درس و تدریس شروع کی تھی۔ حجاز سے واپسی اور شیخ ابوطاہر مدنی سے استفادہ کرنے کے بعد آپ نے ہندوستان میں علم حدیث کی تعلیم کو خاص طور سے فروغ دیا۔ چنانچہ "ہندوستان میں صحاح ستہ کے درس و تدریس کا رواج اسی وقت سے ہوا ہے، جب کہ شاہ صاحبؒ اور ان کے نامور اخلاف نے اس کو بڑی محنتوں سے رواج دیا۔ اور اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اس کی اشاعت پر صرف کر دیا۔ شاہ صاحب نے ایک نیا نصاب درس بھی مرتب کیا تھا، مگر چونکہ اس زمانے میں علم کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درس گاہوں میں منطق و حکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کام و زبان آشنا ہو رہے تھے، اس لئے اس کو مقبول عام ہونا نصیب نہ ہوا۔" [1]

شاہ عبدالعزیزؒ کے انتقال کے تھوڑا ہی عرصہ بعد "امین بالجہر" "رفع یدین" "قراۃ خلف امام" اور اس طرح کے بعض دوسرے مسائل پر دہلی میں مناظرے شروع ہو گئے۔ مولوی عبدالقادر رام پوری اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "مولوی رشیدالدین خان اور مولوی محمد اسمٰعیل نیز مولوی عبدالحئی سے مجلسِ وعظ جامع مسجد شاہجہاں آباد میں جو صورت پیش آئی، نہ ان کی شریف وضع کے شایاں تھی، نہ اس خاندان سے علاقہ رکھنے والوں کے لئے زیبا تھی۔" [2]

---

[1] ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں۔ از ابوالحسنات ندوی۔

[2] اردو ترجمہ "وقائع عبدالقادر خانی"۔ محمد ایوب قادری اس کے حاشئے میں لکھتے ہیں:۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے اگر ایک طرف ردِّ بدعت و شرک میں گرم جوشی سے حصہ لیا، تو دوسری طرف نئے مسائل امین بالجہر، قرأۃ خلف امام، امکان نظیر و امتناعِ نظیر کے مسائل کو رواج دیا۔ ان مسائل سے دہلی (باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور یاد رہے کہ مولوی رشید الدین خان شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے، اور ان کے بارے میں شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہے:- "میری تقریر اسمٰعیل (شاہ شہید) نے لے لی، تحریر رشید الدین اور تقویٰ اسحاق نے"۔ [1] اسی طرح مولوی فضل حق خیر آبادی بھی، جن کے انہی مسائل پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے مباحثے ہوئے، علم حدیث میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے۔

(بقیہ حاشیہ) کے عوام و خواص میں اختلاف پیدا ہوا۔ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں جامع مسجد دہلی میں ان مسائل کے موافقین و مخالفین کے درمیان ایک مباحثہ منعقد ہوا، جس میں فریق اوّل کے سرگروہ مولوی عبدالحیؒ اور شاہ محمد اسمٰعیل اور فریق دوم کے قائد مولوی رشید الدین اور مولوی مخصوص اللہ خان و مولوی محمد موسیٰ فرزندان شاہ رفیع الدین دہلوی تھے، اس مباحثے کی طرف مؤلف روزنامچہ مولوی عبدالقادر نے اشارہ کیا ہے"

[1] جماعت مجاہدین - از مولانا غلام رسول مہر۔

[2] مولوی عبدالقادر مصنف "وقائع عبدالقادر خانی" شاہ عبدالعزیز کے وعظ میں بھی شریک ہوتے تھے، اور شاہ اسمٰعیل شہید کو بھی دہلی میں سرگرم کار دیکھا تھا، وہ ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:- "دہلی میں مولوی محمد اسمٰعیل خلف مولوی عبدالغنی خلف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جو حسنِ بیان، قوتِ استنباط اور تیزی ذہن میں اس زمانے میں اپنے دادا اور چچاؤں کی یادگار تھے، مخلوق کو ان بدعات سے روکنے پر جو مستحبات بلکہ واجبات میں مخلوط ہو گئی ہیں، ہمت باندھ رکھی تھی۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں اور دوسرے دنوں میں اس قسم کے مجمعوں میں بیان کرتے تھے۔ عوام ان کے وعظ و پند سے بہت نفع اُٹھاتے تھے۔ اور جو لوگ بدعات پر عمل کرتے ہیں اور آباؤ اسلاف کو انبیاء و رسل کے مسنونات کا ناسخ سمجھتے ہیں، اگرچہ اس کلمے کے تلفظ سے باز رہتے ہیں، لیکن بدعت شکن پر طعن کرتے ہیں کہ اس کی بات اسلاف کے خلاف ہے، ذرا سوچنا چاہیئے کہ جب کوئی بانیٔ شریعت کی مخالفت پر ملامت کرے تو کیا اس بنا پر کہ بعض خرقہ پوشوں اور اصحابِ دستار کی راہ و رسم کے خلاف ہے، مواخذہ اور سرزنش کا مستحق ہو جائے گا اور جن مشائخ و علماء نے سننِ انبیاء و اسلاف و صلحاء کے مقابلہ میں بدعات جاری کی ہیں، ان سے قیامت میں باز پُرس کیوں نہ ہو گی۔ وہ زمانۂ نبوت کے قرب و بُعد کی وجہ سے بدعت اسلام کی رُو سے سنّت نہیں ہو جاتی۔ (اردو ترجمہ وقائع عبدالقادر خانی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب ان ما بہ النزاع مسائل کا پسِ منظر یہ ہے:" امام ولی اللہ کی عام دعوت اور ان کے حکیمانہ فکر کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ جہاں تک ذہنی اعتبار سے ان کی تعلیمات وافکار کا سوال ہے، ان کا مخاطب انسانیت کا اعلیٰ طبقہ ہے۔ اور چونکہ وہ تمام دنیا میں ایک ہی رنگ رکھتا ہے۔ اس لئے شاہ ولی اللہؒ کی باتیں دوسرے ممالک بھی اسی طرح مان سکتے ہیں جیسے ہندوستان والے، لیکن امام ولی اللہؒ نے عملی طور پر اپنی اس عمومی دعوت کو ہندوستان کے لئے خاص کر دیا تھا اور اسی لئے وہ حجاز چھوڑ کر ہندوستان آگئے تھے۔ ظاہر ہے ہندوستان میں حنفی فقہ کی پابندی ایک حد تک ضروری تھی امام ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ نے خاص طور پر اپنے ملک کے متوسط طبقے اور عوام کو مخاطب بنایا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح امام ولی اللہؒ کے علوم ان کے ذہنوں میں راسخ کر دیں۔ اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ فقہ حنفی اور فقہ شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں، اور شاہ عبدالعزیزؒ فقہ حنفی سے آگے نہیں بڑھتے، لیکن یہ قید صرف مخاطبین کی ضرورت کی وجہ سے تھی، ورنہ جہاں تک ان کی طبیعت نیز خصوصی ماحول مثلاً خاندان اور خاص تلامذہ کا تعلق تھا، وہ اپنے فکر کی بلند سطح سے نیچے اُترنے پر مجبور نہ تھے، لیکن ضرورت تھی متوسط طبقے کو سمجھانے کی، اور ہر ملک کا متوسط طبقہ جدا ہوتا ہے۔ اس لئے شاہ عبدالعزیزؒ کے طریقہ میں ملک کے متوسط طبقے کی خصوصیات کا آنا لازمی تھا۔" [۱]

حضرت شاہ ولی اللہ کی دعوت کا ایک پہلو وہ بھی تھا، جس کا ایک مظہر احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانا اور اُسے مرہٹوں کے استیصال پر آمادہ کرنا تھا[۲] یہی پہلو بعد میں حضرت سید احمد شہید اور

---

۱ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ اس ضمن میں مولانا سندھی لکھتے ہیں۔ جب مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے "حجۃ اللہ البالغہ" امام عبدالعزیزؒ سے پڑھی، تو اپنے جد امجد شاہ ولی اللہ کے طریقے پر عمل کرنا شروع کیا، انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی، جو "حجۃ اللہ البالغہ" پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" کرتے تھے، جیسا کہ سنن میں مروی ہے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی، مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعت پر معترض نہ ہو سکتا تھا ...."

۲ "پانی پت کا میدانِ کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ صاحب کا سجایا ہوا تھا۔ وہ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان مدعو کرنے پر کیوں مجبور ہوئے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ضروری ہے۔" (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات از خلیق احمد نظامی)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد میں اُجاگر ہوتا ہے، گو بالاکوٹ میں اسے وقتی طور پر ناکامی ہوتی ہے، لیکن اس کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ میں اس جدوجہد کا مقصد یہ تھا:۔ "وہ تمام مسلمانوں کو اسلامی جہاد کی روح سے معمور کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ خدا کا کلمہ بلند ہو، سید المرسلینؐ کی سنتیں تازہ ہو جائیں۔ تمام اسلامی بلاد غیروں کے تصرف سے آزاد ہو جائیں۔ وہ صرف سکھوں سے نہیں، بلکہ ان تمام غیر مسلم قوتوں سے لڑنا چاہتے تھے، جو بلادِ اسلامی پر قابض ہو چکی تھیں۔ اور ان کے نزدیک انگریزوں کا خطرہ سب سے بڑا تھا۔" لہ

شاہ ولی اللہ کی دعوت کے یہ جتنے بھی پہلو تھے، ان کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ وہ ان میں کہیں بھی "راسخ العقیدگی" یعنی ORTHODOXY سے نہیں ہٹے یہی ان کی سب سے بڑی عظمت ہے، اور اسی کی وجہ سے وہ ایک ہمہ گیر اور جامع الصفات دینی تحریک کے امام مانے گئے اور ان کے فیوضِ علمی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ شاہ صاحب کی دعوت کے اور پہلوؤں کی طرح اس کا ایک پہلو عقلیت اور RATIONALISM ہے ہم شاہ صاحب ہی کے خیالات کی روشنی میں اس عقلیت کی یہاں وضاحت کرتے ہیں۔

شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:۔ "یہ خیال کرنا کہ احکام شرعیہ کی بنیاد مصالح و حِکَم پر نہیں اور اعمال و جزا میں کوئی مناسبت نہیں، خیال فاسد ہے۔ سنّتِ نبوی اور اجماعِ قرونِ مشہودٌ لہا بالخیر اس خیال کی تغلیط کرتا ہے۔ جو شخص یہ بھی نہ سمجھ سکتا ہو کہ اعمال کا دار و مدار نیت اور انسان کی ہیئات نفسانیہ پر ہے، وہ علم و فہم سے بالکل ہی بے بہرہ ہے۔" متعدد آیتیں اور حدیثیں بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سب اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ شرائع کی بنیاد مصالح و حِکَم پر ہے۔ اور ہر زمانے میں علماء اس کے قائل رہے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے .... "صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد تابعین اور تابعین کے بعد علمائے مجتہدین احکام و شرائع کے اسرار و اسباب برابر پیش کرتے اور احکام و شرائع کے معانی سمجھاتے رہے۔ اور شریعت کے منصوص احکام کی مناسب علت و سبب بیان کرتے رہے کہ

لہ سید احمد شہید۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ حکم فلاں ضرر یا فلاں نقصان کے دفعیہ کے لئے ہے اور فلاں فلاں منفعت اور بہتری کے لئے ہے۔ اور یہ تمام باتیں ان کی کتب اور مذاہب کے اندر عام طور پر بکثرت مروی ہیں۔ اور پھر ان کے بعد غزالی، ابو سلیمان احمد بن محمد البستی، الخطابی اور عزالدین ابن عبدالسلام اور ان جیسے دیگر علمائے کرام کی مساعی جمیلہ قابلِ صد تشکر ہیں کہ اُنھوں نے بھی احکام و شرائع کے نکات اور علل کے متعلق اپنی تحقیقات پیش کیں۔"

غرض احکام و شرائع کی حکمتوں کی توضیح کی مسلمانوں کے ہاں شروع ہی سے جو فکری تحریک چلی آتی تھی، شاہ صاحب نے اس کو آگے بڑھایا ہے، اور یہی ان کی دعوت کا وہ پہلو ہے، جسے ہم عقلیت کا نام دیتے ہیں۔ عقلیت کی اس دعوت میں وہ اصولاً کہیں بھی "راسخ العقیدگی" سے نہیں ہٹے، چنانچہ وہ حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:-

"میں نے اس علم پر لکھنے کی تب ہی جرأت کی کہ قرآنی آیات، احادیثِ نبویؐ اور آثارِ صحابہ و تابعین کو اپنا موید پایا، نیز علمائے اہلِ سنّت کو جو علم لدنی سے فیض یاب تھے، اس میں کلام کرتے دیکھا اور اپنے اصول و قواعد کو اس پر قائم کرتے پایا۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی وضاحت کر دی:-

"یاد رہے کہ میں ہر اُس قول سے بری ہوں، جو کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ صلعم یا اجماع خیر القرون یا جمہور مجتہدین یا سوادِ اعظم مسلمین کے خلاف مجھ سے صادر ہو جائے، اور اگر کوئی ایسی بات مجھ سے صادر ہو جائے، تو وہ میری خطا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے، جو مجھے میری غفلت سے آگاہ اور خبردار کر دے ...."

شاہ ولی اللہ کا ۱۷۶۲ء میں انتقال ہوا۔ اس سے پانچ سال پہلے انگریز پلاسی کے میدانِ جنگ میں سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قابض ہو چکے تھے، اس کے بعد وہ بڑی سرعت سے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں متسلط ہوتے گئے، یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء میں سلطنتِ مغلیہ کا دارالسلطنت دہلی ان کے قبضے میں آگیا، اور ملک میں جتنے بھی ان کے سیاسی حریف ہو سکتے تھے، وہ سب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے، شاہ ولی اللہ کی زندگی میں اور ان کے بعد ۱۸۰۳ء تک دہلی پر بڑی بڑی مصیبتیں آئیں، اور اسے ہر حملہ آور اور غارت گر نے لوٹا اور وہاں قتلِ عام کیا۔ مرہٹے، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی، جاٹ، روہیلے اور بعض دوسرے گروہ دہلی کی اس غارت گری اور خون ریزی میں ایک دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بازی لے جاتے رہے ہیں، ۱۸۴۶ء میں دہلی کی جو حالت ہوگئی تھی، اس کا کچھ اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے، جو وہاں کی مقامی مجلس نے حکومت انگریزی کی ایک گشتی چٹھی کے جواب میں لکھا تھا۔

"جب آپ کی کمیٹی کے ارکان اس ملک کے گزشتہ عہد کے عروج اور شان و شوکت کو یاد کریں گے جب کہ دہلی اس عظیم الشان اور وسیع سلطنت کا شاندار دار الخلافہ تھی، جو علوم و فنون کی سرپرستی اور ہنر پروری کے لئے چار دانگِ عالم میں مشہور تھی اور اس کے زرخیز و خوش حال خطوں کے فرزند علم کے شوق میں اس مشرقی علوم کے گہوارے میں جوق جوق آتے تھے اور جہاں ایسے ایسے شاعر اور حکیم پیدا ہوئے ہیں، جن کے نام اب تک تاریخ کے صفحات پر یادگار ہیں اور پھر جب آپ کے ارکان ان بے شمار تعلیم گاہوں کے کھنڈروں کا خیال کریں گے جو ان شاہانہ فیاضیوں کے آثار ہیں، جو علم کی اشاعت و ترقی کے لئے وقف تھیں اور اب خراب و خستہ اور شکستہ حال ہیں اور جب وہ گزشتہ عہد کی ان مقدس علمی یادگاروں کو دیکھیں گے جن پر اب ویرانی و بے کسی برستی ہے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں تو ہمیں یقین ہے ......"

یہ تھی شاہ عبدالعزیز کے دور کی دہلی، جہاں تک کہ اس کی عام مادی و علمی حالت کا تعلق ہے۔ لیکن اس کے علاوہ دہلی اور جس وسیع و عریض ملک کی وہ دار الحکومت تھی، اسی دور میں اس پر ایک اور قسم کی یورش کا بھی آغاز ہوا، اور یہ یورش تھی ایک نئے سیاسی و معاشی[لہ] نظام اور ایک نئے نظم و نسق حکومت (ایڈمنسٹریشن) کی،

لہ کے ایم پانیکار اپنی کتاب ASIA AND WESTERN DOMINATION میں لکھتے ہیں :- ہندوستان کے ساحلی شہروں پر یورپی تجارتی مرکزوں کے قیام سے بنیوں کو بڑا عروج ملا۔ اور بنگال کے مارواڑی کروڑپتی بڑے طاقت ور ہو گئے۔ اس طاقت ور طبقے کا ظہور، جس کے معاشی مفادات غیر ملکی سوداگروں سے وابستہ تھے، اور جسے مسلم دورِ حکومت سے نفرت ورثے میں ملی تھی، ہندوستان اور ایشیا کی تاریخ میں بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے ملک کی معیشت زرعی تھی، اس لئے قدرتاً سیاسی طاقت تمام تر زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھی۔ یورپی سوداگروں کی آمد نے بیرونی تجارت کو فروغ دیا، اور اس کے ملکی گماشتے آگے آ گئے " اب زرخیز وادی گنگا کی پیداوار مارواڑی تاجروں کے ذریعہ جن کی ایجنسیاں تمام شمالی ہند میں قائم تھیں، بنگال کی بندرگاہوں پر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی تہذیب، نئے مذہب، نئے نظامِ فکر، اور نئی سماجی، ادبی، روحانی و اخلاقی قدروں کی بھی۔ یورپی قوموں اور بالخصوص انگریزوں کی آمد اس یورش کا باعث بنی اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کی وسعت و شدت بڑھتی گئی۔ اور آخر میں یہ ہوا کہ شمالی ہند جس کا مرکزی شہر اس وقت دہلی تھا۔ سیاسی و معاشی لحاظ سے بتدریج کمزور ہوتا گیا اور برِ صغیر کی سیاسی و معاشی طاقت کے محور منتقل کلکتہ اور بمبئی بن گئے، اور اس کے نتیجہ میں بادشاہتیں، نوابیاں، جاگیرداریاں اور زمینداریاں، جن میں قدرتاً مسلمانوں کا حصہ غالب تھا، ختم ہوتی گئیں، اور مدراس کے مشہور صاحبِ قلم پانیکار کے الفاظ میں ان کی جگہ ٹام راج اور بنیا راج استحکام پذیر ہوتا گیا۔

جہاں تک حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اور ان کے آثارِ علمی کا تعلق ہے، ان میں ہمیں اس نئی یورش کا جس کا دائرہ اس وقت ظاہر ہے ہندوستان کے ساحلی علاقوں خاص طور پر کلکتہ اور بمبئی تک محدود تھا۔ ردِّ عمل[1] نہیں ملتا، چنانچہ ان کی تمام تر توجہ ان فتنوں ہی کی طرف رہی جو اس وقت شمالی ہند میں برپا تھے،

(بقیہ حاشیہ) پہنچنے لگی، اور وہ مؤثر قوت کے مالک ہو گئے۔ صوبہ داروں کے درباروں میں وہ اس فریق کی حمایت کرتے، جو انہیں قرضے پر زیادہ سود دیتا، اور جس سے ان کو زیادہ تجارتی مراعات ملتیں۔ بنگال میں ان کی طاقت سب سے زیادہ تھی۔ سراج الدولہ جگت سیٹھ نامی ایک کروڑپتی کی سازش کا شکار ہوا، جس کی سراج الدولہ نے برسرِ دربار بے عزتی کی تھی۔

[1] "........ جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے، اسی دور میں یورپ قرونِ وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہاں ہر علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے، جنہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل دی ...... حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الٰہ آباد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا، مگر انہوں نے اس نئی اُبھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں تو دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے، مگر ان کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے۔ اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسبابِ طاقت کیا ہیں ......"

(از ماہنامہ الفرقان۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جن کے انسداد کے لئے ان کی نگاہیں بعض دفعہ ماورائے دریائے سندھ اُٹھتی تھیں۔

دراصل شاہ ولی اللہ صاحب بحیثیت ایک عالمِ دین متکلم، حکیم، صاحب معرفت صوفی اور اہلِ علم و قلم کے ان اعاظمِ اسلام کے اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں جس میں ابنِ رشدؒ، غزالیؒ، رازیؒ، ابنِ تیمیہؒ اور ان پائے کے دوسرے بزرگوں کا ایک ممتاز مقام ہے، چنانچہ مولانا شبلیؒ نے شاہ صاحب کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے:۔

"ابن رشدؒ اور ابنِ تیمیہؒ کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہ تھی کہ پھر کوئی صاحبِ دل و دماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشہ دکھانا تھا کہ آخر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالیؒ، رازیؒ اور ابنِ رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

اور ایسے ہی نواب سیّد صدیق حسن خان آپ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اگر وجودِ اُو در صدرِ اوّل دور زمانہ ماضی مے بود، امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ مے شد"

بے شک شاہ ولی اللہ صاحب نے اس نئی طاقت کا جو کئی ہزار میل سے آکر ہندوستان میں اپنے قدم جما رہی تھی، "نوٹس" نہیں لیا، اور ان کی نظریں زیادہ طرح شمال کی طرف رہیں، لیکن شاہ عبدالعزیزؒ کے بارے میں یہ کہنا ہمارے نزدیک زیادہ صحیح نہیں ہوگا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اس زمانے میں انگریزوں، ان کی زبان اور اس کی تعلیم سے عوام بلکہ خواص بھی کافی متنفر تھے[1] اور اسے ترویجِ مذہبِ عیسوی کا ذریعہ گردانتے

---

[1] ۱۸۲۸ء میں دہلی کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا۔ اس بدعت سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ دین دار بزرگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کے مذہب بگاڑنے اور اندر ہی اندر عیسائی مذہب کے پھیلانے کی ترکیب ہے۔ یہی مشکل بنگال میں پیش آئی تھی ...... وہاں مخالفت برہمنوں سے شروع ہوئی تھی، تو یہاں مسلمان پیش پیش تھے۔ یہ بدگمانی کچھ زیادہ بے جا بھی نہ تھی۔ بات یہ ہے کہ ابتدا میں جب لڑکے انگریزی مدرسوں میں داخل ہوئے اور وہاں نئی نئی چیزیں دیکھیں اور پڑھیں تو وہ اس قسم کی واہی تباہی باتیں کرنے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے انگریزی پڑھنے کے حق میں فتویٰ دیا۔ آپ نے فرمایا۔ کالج انگریزی میں جانا اور پڑھنا انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔ بلکہ بعض صورتوں میں آپ نے انگریز کی نوکری کو بھی جائز قرار دیا۔ اور بکثرت مسلمان انگریزوں کی ملازمتیں بھی کرنے لگے ہیں اور بعض بڑے بڑے عہدوں پر بھی پہنچے۔ مولانا رشید الدین خان، شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ وہ دہلی کالج میں جو ایک سرکاری ادارہ تھا، مدرس تھے، ان کا ۱۸۳۳ء میں انتقال ہوا، تو ان کی جگہ مولانا مملوک علی استاد مقرر ہوئے جن کے شاگردوں میں سے مولانا محمد قاسم بانی دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی، سید احمد خان بانی علی گڑھ کالج، مولانا نذیر احمد مترجم قرآن مجید اور مولانا ذکاء اللہ بڑے مشہور ہیں۔ آپ نے ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں دہلی میں وفات پائی اور حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ [2]

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی مرتب کردہ "ابوالکلام کی کہانی" میں ایک صاحب مولوی عبدالرحیم دہری

(بقیہ حاشیہ) لگے، جس سے پرانے خیال کے لوگوں کو خواہ مخواہ بدگمانی کا موقع ملا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ مسلمان طلبا کی تعداد انگریزی شعبے میں اکثر کم رہی۔ (مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق)۔

اسی زمانہ میں مولانا حالی پانی پت سے دہلی میں آئے، وہ لکھتے ہیں: "ڈیڑھ برس دہلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج (دہلی کالج) کو جا کر آنکھ سے نہ دیکھا۔ (کیونکہ) جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان پر سمجھا جاتا تھا اور انگریزی تعلیم کی طرف لوگوں کو کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ کہ اس سے علم حاصل ہوتا ہے (مرحوم دہلی کالج)

[1] علمائے ہند کا شاندار ماضی، از مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند ص ۳۹ د ص ۲۴۴۔

[2] سرکاری درس گاہ میں سالہا سال ملازم رہنے کے باوجود انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ریذیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے تو آپ کے علم اور مرتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے تو مولانا نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا، جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔

(دہلی کی آخری شمع از مرزا فرحت اللہ بیگ۔ ماخوذ از علماء ہند کا شاندار ماضی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ذکر آیا ہے، مولانا آزاد کی زبانی ان کا قصہ یوں بیان کیا گیا ہے :-

وہ شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں تھے اور مولانا اسمٰعیل شہید کے ہم درس۔ کلکتے میں نیا نیا فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تھا۔ اس میں بحیثیت مدرس کے ملازم ہو گئے .... انگریزی میں ایسی عمدہ استعداد پیدا کرلی تھی .... دکہ) سب کہتے کہ کوئی انگریز بول رہا ہے .... لیٹن بھی ایسی ہی فصاحت سے بولتے تھے۔ عربی، فارسی، ترکی، پشتو اور ہندوستان کی زبانوں میں بھی یہی حال تھا ...... ریاضی اور ہندسے کے بہت بڑے ماہر تھے .... جان مارشن کلاک کی ہسٹری آف انڈیا کا نہایت ہی فصیح اور بامحاورہ فارسی میں ترجمہ کیا .... ایک رسالہ عربی میں جرثقیل پر ہے اور اس میں جدید علم میکانک کے اصول ضبط کئے ہیں ۔“

مصنف نے مولانا آزاد کی زبانی یہ بھی بیان کیا ہے کہ مولوی عبدالرحیم "دہری" سرسیّد سے پہلے علوم جدیدہ کے داعی تھے اور انہوں نے فارسی میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس کا عنوان تھا "عرض داشت در باب ضرورت ترویج زبان انگریزی و علوم فرنگ"۔ اسی سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے انگریزی زبان کی ضرورت پر صرف علمی حیثیت سے نظر ڈالی ہے، ان کا کہنا تھا کہ علوم میں انقلاب آچکا ہے علوم قدیمہ اب تحقیقاتِ جدیدہ کے مقابلے میں تقویم پارینہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کے لئے بھی ترقی و تقدم کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ ان علوم کی تحصیل کریں۔

بقول مولانا ملیح آبادی، مولانا آزاد نے ان کے بارے میں فرمایا :-

"عام طور پر یہ "عبدالرحیم دہری" کے نام سے مشہور ہیں، لیکن میں نے بہت جستجو کی، بجز شہرتِ عام کے کوئی تحریری ثبوت ان کی دہریت کا نہیں ملا۔ معلوم نہیں، وہ صحیح معنوں میں دہری بھی تھے یا یہ بھی لوگوں کی اختراع ہے۔ عموماً ایسا ہوا ہے کہ جہاں ایک شخص نے شاہراہِ عام سے باہر قدم رکھا، یا مذہبی عقائد کے باب میں استدلال و احتجاج کی کوئی نئی شکل اختیار کی، یا اس طرح کا مشرب، جیسا سرسید وغیرہ کا تھا تو عام طور پر اسے دہریت ہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، معتزلہ کی نسبت بھی ایسے ہی خیالات ظاہر کئے گئے تھے۔ پس عجب نہیں کہ مولوی عبدالرحیم کا بھی یہی حال ہو، اور عقلیات کے اشتغال و انہماک کی وجہ سے دہری مشہور ہو گئے ہوں ۔“

مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند $\frac{١٢٦٠ھ}{١٨٤٤ء}$ میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے تیرہ سال قبل مولانا مملوک علی صاحب کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہلی آئے تھے۔ مولانا موصوف سے گھر میں پڑھنے کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بیان کے مطابق مولانا محمد قاسم کا نام دہلی کالج میں بھی داخل تھا۔ مولانا محمد قاسم کے ہم درس اور مولانا مملوک علی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نے بھی لکھا ہے:۔" والد مرحوم (مولانا مملوک العلی) نے مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے معترض نہ ہوجیو۔ میں ان کو پڑھاؤں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھو اور قواعد حساب کی مشق کرلو...... جب امتحان کے دن ہوئے مولوی صاحب (مولوی محمد قاسم) امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔" ۱؎

مولوی بشیر الدین (ابن مولانا نذیر احمد) نے اپنی کتاب "دارالحکومت دہلی" میں لکھا ہے کہ منشی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد اور یہ (ڈاکٹر ضیاء الدین ایل ایل ڈی) دلّی کالج کے نامی گرامی طالب علم تھے۔ ایک ساتھ پڑھے اور سب کے سب شمس العلماء بن کر چمکے۔" اسی کتاب میں لکھا ہے کہ مولوی یعنی ڈاکٹر ضیاء الدین مولوی مملوک علی صاحب نانوتوی مشہور عالم کے شاگرد تھے۔ مولوی بشیر الدین صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی سمیع اللہ جو ایم او کالج کے بنانے میں سرسید کے ساتھیوں میں سے تھے، اور اسی زمانے میں علی گڑھ میں سب جج تھے۔" مولوی مملوک العلی صاحب مشہور و معروف عالم و فاضل سے تعلیم پائی۔" ۲؎

اس تمام طول بیانی سے دراصل اس امر کی طرف توجہ دلانا ہے، کہ شاہ ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیز اور ان کے شاگردوں کے زمانے میں یورپ سے آنے والے علوم ۳؎ وفنون کی طرف بے شک توجہ کی گئی، اور

۱؎ ماخوذ از سوانح قاسمی مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ گو مصنف مرحوم نے اس واقعہ کو قطعاً غیر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن مولانا محمد قاسم کے ہم درس کے اتنے واضح بیان کرنے کے بعد یہ کوشش غیر ضروری سی معلوم ہوئی، اور پھر اس زمانے میں سرکاری محکمہ تعلیم سے منسلک ہونا چنداں قابلِ اعتراض نہ سمجھا جاتا تھا۔ خود مولانا مملوک علی دہلی کالج میں مدرس تھے، ان کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب کچھ عرصہ (۱۸۵۷ء سے قبل) غالباً اسکول کے ہیڈ مولوی یا ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات ہو کر اجمیر میں رہے ہے"۔ (سوانح قاسمی مولانا مناظر احسن) مولانا محمود حسن شیخ الہند کے والد بزرگوار مولانا ذوالفقار علی محکمہ تعلیم سے منسلک تھے

۲؎ سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی۔

۳؎ یورپ کے ان علوم وفنون کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:۔"...... یہاں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں، جو ایک نہایت محدود حلقے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کو حاصل کرنے کی کوششوں کی تمہید بھی پڑی لیکن بعض خارجی حالات ایسے تھے، جو اس اخذ و استفادہ کی راہ میں حائل ہوئے، اور ہمارا علمی و فکری کارواں بجائے آگے بڑھنے کے بعض امور میں رجعتِ قہقہری کا شکار ہوگیا۔ اور تحریکِ ولی اللہی کی "عقلیت" سے وہ علمی و فکری نتائج نہ نکلے، جو اخذ و استفادہ کی وجہ سے نکلنے چاہیئے تھے۔

ان خارجی حالات میں سے ایک تو انگریزی حکومت کا یہ رویہ تھا کہ اس نے کہیں کہیں انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون کی تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ سر سید نے اپنی کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" میں حکومت کی اس پالیسی پر بڑی سخت تنقید کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری تنخواہ لیتے ہیں۔ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کے دیتے ہیں۔ اور ہر طرح ان کے مددگار و معاون ہیں .... یورپین حکام اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی میں آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو .... پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے، جس سے سننے والوں کو نہایت

(بقیہ حاشیہ) تک پہنچ کر رہ گئیں۔ اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں، جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخر کار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہوگئیں۔ یہاں فلسفۂ اخلاقیات، اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم پر طرحِ نو کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک رہی، جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا، اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظامِ فکر مرتب ہوگئے، جنہوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یہاں علومِ طبعیہ اور قوائے مادیہ کا عالم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا اور وہاں اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی اور اس ترقی کی بدولت اہلِ مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ ان کے مقابلے میں پرانے آلات و وسائل کے زور سے کامیاب ہونا قطعی محال تھا (منصب تجدید کی حقیقت)۔ شاہ عبدالعزیز کے شاگرد مولوی عبدالرحیم "دہری" نے بھی اپنے زمانے میں یہی بات کہی تھی۔ لیکن اس کی وجہ سے وہ مطعون ہوئے، اور "دہری" کہلائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رنج اور تکلیف پہنچتی تھی ...... بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہدان (مشنری) سکولوں میں جاتے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا نجات دلانے والا کون ہے؟ وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے، اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔ "[1]

اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" میں مولانا عبدالحق نے لکھا ہے: "دہلی کالج کے دو ہندو اُستاد عیسائی ہو گئے۔ اس سے دلی کی مخلوق بہت بگڑی اور شہر میں بڑا غلغلہ پیدا ہوا۔ ایسا سننے میں آیا ہے کہ بعض اور طالب علم عیسائی ہونے پر تلے ہوئے تھے، لیکن دلی والوں کے ڈر سے رہ گئے ...... جنوری ۱۸۵۳ء میں لوگوں کا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ گیا اور پھر لڑکے داخل ہونے شروع ہو گئے ...... مسلمان طلبا میں بھی انگریزی زبان سیکھنے کا شوق بڑھتا جاتا تھا۔" دوسرے انگریزوں نے مسلمانوں کی حکومت ختم کی تھی۔ ان کی نوابیاں، جاگیریں اور زمینداریاں چھینی تھیں۔ جو لوگ پہلے ریاست، امارت اور شان و شوکت کے مالک تھے وہ در بدر پھر رہے تھے۔ ان کے روزی کے وسائل بالکل ختم ہوتے جا رہے تھے۔[2]

اور تیسری بات یہ تھی کہ یورپ کے ان علوم وفنون کے ساتھ ساتھ وہاں کی سماجی، تہذیبی اخلاقی قدریں بھی درآمد ہو رہی تھیں، جو اس ملک کے رواجوں اور عادات کے بالکل خلاف تھیں، چنانچہ عوام وخواص ہر دو کا ان کی مخالفت میں سخت ردِّعمل ہونا فطری تھا۔

انگریزی عمل داری کی وجہ سے یورپ سے آنے والے علوم وفنون کے بارے میں مسلمانوں کے ہاں عمل و ردِّعمل کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا، جسے فرو کرنے میں انگریزوں نے بالخصوص مسلمانوں پر وہ مظالم کیے کہ ان میں انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور اس کے علوم سے بہت زیادہ نفرت ہو گئی۔ یورپ کے

---

[1] ماخوذ از سوانح قاسمی مصنفہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔

[2] بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں، جو ادنیٰ ادنیٰ حیلہ پر ضبط ہو گئیں ...... اہلِ حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیائے تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا ...... ہندوستان کی رعایا روز بروز مفلس ہوتی جاتی تھی۔ ٹیکس کی زیادتی نے زمینداروں اور کاشت کاروں کو تباہ کر دیا تھا۔ بقایا وصول کرنے کے لئے زمینداریاں نیلام کرائی جاتی تھیں ...... غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہو گیا تھا۔ اگلے خاندان جن کو ہزاروں کو مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ آ گئے تھے اور یہ اصلی سبب ناراضگیٔ رعایا کا گورنمنٹ سے تھا۔

(اسباب بغاوتِ ہند، ماخوذ از علماء ہند کا شاندار ماضی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علوم وفنون اور افکار وخیالات کو اپنانے کا عمل سست پڑ گیا۔ اور مسلمانوں کے ہاں ذہنی ارتقار رُک گیا۔

جب دہلی ۱۸۵۷ء میں تباہ وبرباد ہونے کے بعد پھر بسی، تو وہاں وہ علمی وفکری زندگی نہ رہی تھی، جسے پیدا کرنے میں شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے شاگردوں کا ایک طرف اور دہلی کالج کا دوسری طرف حصہ تھا۔ مولانا محمد قاسم، سر سید احمد خان، مولانا نذیر احمد، مولانا ذکار اللہ اور اس دور کے بعض دوسرے بزرگ دہلی کی اسی علمی وفکری زندگی کے وارث تھے، اور آگے چل کر انہیں سے وہ علمی وفکری تحریکیں چلیں، جن میں کہیں زیادہ اور کہیں کم شاہ ولی اللہ کی "راسخ العقیدگی" اور "عقلیت" کی جھلک تھی۔ اب دیوبند میں "راسخ العقیدگی" "عقلیت" پہ مقدم رہی اس لئے وہاں قدامت پسندی اور محافظت وسلفیت (CONSERVATISM) کا غلبہ ہوا۔ اس کے برعکس سر سیّد نے "عقلیت" کو مقدم رکھا، اس سے فطرتاً انحراف بروئے کار آیا۔ [1]

بقول مولانا سندھی کے "مولانا محمد قاسم تیرہویں صدی کے مجدّدین میں سے تھے۔ آپ نے ولی اللہی حکمت و معارف کو اہلِ ہند کے لئے زمانہ حاضر کے لباس میں پیش کیا"۔ اس طرح سر سید احمد خان نے اپنے مخصوص مذہبی افکار کی اشاعت میں امام غزالی، ابنِ رشد کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات سے بہت مدد لی غرض اس طرح ولی اللہی حکمت کے "عقلیت" کے پہلو کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ [2]

---

[1] ۱۸۵۷ء کے بعد" دہلی کے ایک مرکز کے بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصے کو دیوبند لے گئے اور سر سید احمد خان نے دہلی کالج کے انگریزی حصے کو علی گڑھ پہنچا دیا۔"
(شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک از مولانا سندھی)۔

[2] "........ (سر سید) خوب جانتے تھے کہ مغربی علوم کی رَو سے ایک دن تند ہوا چلے گی کہ مذہب کی بنیاد کو بالکل بہا لے جائے گی۔ کوئی صورت ہو، جس سے نوتعلیم یافتگانِ ملک کو مذہب اور علومِ جدیدہ میں کسی قسم کا تخالف نہ معلوم ہو، کیونکہ علمائے اسلام نے بھی فلسفۂ یونان کے عام شائع ہو جانے پر ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ ان کا خود یہ قول مشہور ہے کہ میں نے جو کچھ کیا، نئی اُمت کے لوگوں کی خاطر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس خیال سے سیّد صاحب کی نیک نیتی کا ثبوت ملتا ہے ...."
(دما فی الاسلام از مولانا اصغر علی روحی معلم دینیات وادبیات، اسلامیہ کالج لاہور، مطبوعہ ۱۳۵۰ھ)

© rasailojaraid.com